اردو زبان ہمارا قومی ورثہ لیکن!

زہرا بتول
ریسرچ اسکالر شعبہ علوم اسلامی

ABSTRACT:

Urdu is a lively and rich language,encompassing different words from languages all over the world.Like all other languages,urdu too,has its own philosophy-the effects of which are evident from those speak,listen and comprehend it.This language has been used by the people of the subcontinent for years and today by other nations living in the subcontinent Pakistan and India, to express their ideologies.

Urdu has left a very strong impression on our culture, civilization and Islamic ideology. All languages play an important role in portraying as well as elaborating the visions of people.Similar is the case of Urdu which has the added advantage of being the third ,most widely used language in the world.

But it is indeed a distress that a language that can prove to bring peace and stability on our regional front is facing such decline.The aim of this paper is to discuss the rise and fall of this language and to enhance our knowledge in the same.

اردو زبان ہمارا قومی ورثہ ہے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔اس زبان کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں، جبکہ یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ زبانیں تبادلہ خیال کا موثر ترین ذریعہ ہوتی ہیں اور ان کے ہماری زندگی پر گہرے اور دوررس اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں، دیکھا جائے تو روز افزوں سائنسی ایجادات اور چاند پر چہل قدمی کا دعویٰ کرنے والا انسان اپنی تمام تر ترقی کے باوجود ابھی

تک لفظوں کا پابند اور غلام ہے، وہ اپنا مافی الضمیر لفظوں کے پورے تعاون کے بغیر ادا نہیں کرسکتا ہے۔ لہٰذا الفاظ کی حاکمیت اور اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے ایک مفکر نے کچھ اس طرح سے کہا کہ! 'میرا منتخب لفظ صرف میرے ذاتی معنی ادا کرتا ہے۔

اردو پاکستان اور ہندوستان کی وہ واحد زبان ہے جو درہ خیبر سے چاٹگام اور رنگون سے قلات تک میں لکھی، پڑھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اردو زبان ایک زندہ اور متحرک زبان ہے، گو کے مختلف زمانوں میں اس کے مختلف نام بھی رکھے گئے جن میں ہندی، ہندوی، ہندوستانی انڈوستانی، ریختہ۔ گجراتی اور مورش شامل ہے، دیگر زبانوں کی طرح اس کی بھی ایک فلاسفی ہے جس کے اثرات اس کے بولنے، سننے اور سمجھنے والوں پر واضح ہیں۔ یہ زبان برصغیر پاک و ہند میں بسنے والی قوم کے نظریات کی ترجمان ہے۔ اور اس نے ہماری تہذیب وتمدن ثقافت اور مذہبی عقائد ونظریات پر گہرے اثرات بھی مرتب کئے ہیں۔ زبانیں دراصل انسانی احساسات ونظریات کی وضاحت میں معاون اور اہم کردار ادا کرتی ہیں، لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ اردو زبان جو کہ نفسیاتی سطح پر ہمارے خطے کی نمائندہ زبان ہے وہ زوال کا شکار ہے جبکہ اردو کو خطے سے جڑنا چاہئے اور جو خلیج درمیان میں حائل ہے، ہمیں اس زبان کے فروغ سے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

اردو زبان کا ارتقائی سفر

ایک قدیم نظریے کے مطابق جو سید احمد (مولف فرہنگ آصفہ) نے پیش کیا وہ یہ ہے کہ! تقریباً ایک ہزار قبل مسیح جب ایران کے حکمرانوں نے ہندوستان کا رخ کرنا شروع کیا تو انھوں نے اپنی زبان کے الفاظ کا اثر مقامی زبانوں پر بھی ڈالا، کیونکہ نو سو سال قبل مسیح میں ایران کا حکمران کاکاؤس تھا جو کے ہندوستان کے کئی حصوں پر قابض تھا۔ جبکہ مولوی سید احمد کا یہ خیال ہے کہ!

> ''اصل میں یہی زمانہ اردو کی بنیاد پڑنے کا پورا پورا زمانہ ہے کیونکہ اس وقت راجہ بھرت تخت ہند پر جلوہ افروز تھا اور اس کے عہد میں برج بھاشا اضلاع متھرا نیز ممالک مغربی میں اور پوربی بھاکا ممالک مشرقی میں رائج ہوئی، اور اسی نے زبان اردو کو اپنی آغوش محبت لیا'' (۱)

اسی طرح سے اردو کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے محمد عطا حسین خان تحسین نے 'نوطرز مرصع' میں استعمال کیا ہے۔ بعد ازاں میراں من نے 'باغ و بہار' مولفہ ۱۸۰۱ء میں اسے زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے، یہ ایک طرح کی مخلوط زبان ہے جس میں حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ اور واحد جمع تک کے اصول اگرچہ اس کے اپنے ہیں، لیکن اس کی تخلیق عربی اور فارسی زبانوں اور مقامی بولیوں (پراکرتوں) کے ساتھ میل جول سے ہوئی ہے، عربی زبان کا اثر محمود غزنوی کے ذریعے پنجابی پر ہوا جو بعد ازاں اس نئی بولی کو گنگا جمنا کے دوآبے میں لے گئی۔ جب

دہلی اسلامی حکومتوں کا دارالحکومت بنا تو مقامی باشندوں کے ساتھ میل جول کے ساتھ ہی عربی، فارسی اور ان کی مخلوط زبان پر بھی اثرات مرتب ہوئے اور یوں اس اختلاط کے نتیجے میں ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے بعد میں اردو کا نام دیا گیا۔(۲)

اسی طرح سے جب علاء الدین خلجی نے دکن کو فتح کیا اور محمد بن تغلق نے دہلی کو خالی کرا کے دولت آباد (دکن) آباد کیا تو سندھ، پنجاب اور دہلی کے علاقے کی مخلوط زبان (اردو) گجرات اور حیدرآباد میں داخل ہوگئی ہر چند کے پنجاب اور دوآبے کے علاقوں میں یہ نئی زبان ترقی پذیر تھی، لیکن دکن پہنچ کر اس زبان نے ترقی کے نئے باب رقم کئے۔ اور ہوتے ہوتے شمالی گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں بھی اس کی بہت قدر افزائی کی گئی۔ چنانچہ اس عہد کی سب سے پہلی کتاب حضرت سید محمد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی 'معراج العاشقین' سمجھی جاتی ہے۔(۳)

جبکہ اگر دیکھا جائے تو اردو کے اولین شعراء میں امیر خسرو کا نام بھی سرفہرست ہے انھیں اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کے تمام عناصر ارضی کو اپنی شاعری میں سمو لیا یہی نہیں بلکہ اس زبان کے فروغ کیلئے اپنی انتہائی توانائیوں کو بھی صرف کرنے سے گریز نہیں کیا اور اس زبان کو جدیدیت سے ہم کنار کیا انھیں اردو کی ایک اہم ادبی تحریک کا بانی بھی مانا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے ہی سب سے پہلے اردو کے ریختہ کی ترویج میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں چونکہ اردو کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں تھی اسی لئے امیر خسرو نے اپنی شاعری کیلئے جس روزمرہ زبان کا استعمال کیا اسے وہ 'ہندوی' کہتے ہیں۔ جبکہ وہ خود 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں کہ!

> 'میں نے ہندی میں نثر بھی لکھی ہے اور شعر بھی کہے ہیں۔ لیکن یہاں ہندی کلام شامل کرنے کا جواز نہیں۔ فارسی زبان کی لطافت وحلاوت ہندوی پیوندکاری کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ البتہ بعض جگہوں پر بنائے ضرورت ہندی لفظ پیوند کردئے ہیں۔ ہندی زبان سے مجھے لگاؤ ہے، بلکہ یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ! ہندوستان کے طیور بھی مجھ سے ہندی میں گفتگو کرتے ہیں'۔(۴)

اگر دیکھا جائے تو امیر خسرو کی اسی پیوندکاری نے دو زبانوں کو باہم ملایا، اور ان کے امتزاج کا سبب بھی بنی یہی نہیں بلکہ اس ملاپ سے دو تہذیبوں کے ادغام میں بھی مدد ملی اور ایک نئی زبان کی تشکیل کی راہ بھی ہموار ہوئی۔

بقول شمس اللہ قادری کہ! اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت جو زبان رائج تھی وہ موجودہ زبان سے زیادہ غیر مانوس نہیں تھی۔(۵)

جبکہ عبدالمجید سالک کہتے ہیں کہ! خسرو کی زبان اس زمانے میں عوام کی زبان بن چکی تھی اور انصاف تو یہ ہے کہ وہ اردو زبان کے سوا کچھ نہیں ہے۔(۶)

رام بابو سکسینہ امیر خسرو کو نا صرف اردو کا شاعر اور ادیب کہتے ہیں بلکہ انھیں اردو کا موجد اور مخترع بھی قرار دیتے

ہیں۔(۷) امیر خسرو جس زبان کو 'ہندوی' کہتے ہیں۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کہتے ہیں کہ! 'ہندوی' دراصل اردوئے قدیم کو کہا جاتا ہے۔(۸) خسرو نے اپنی شاعری سے اردو کو تخلیقی زبان کا درجہ دیا اور اس کے ساتھ ہی اس لڑکھڑاتی ہوئی زبان کو تہذیبی رفعت بھی عطا کی۔کیونکہ خسرو حیاتیاتی سطح پر تہذیبی اشتراک کی پیداوار تھے۔(۹)

صوفیانہ تحریک

پھر آٹھویں صدی عیسوی میں جب عربوں نے سندھ اور ملتان پر اپنی گرفت کو مضبوط کیا اور یہاں قابض ہوئے تو سیاسی غلبے کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر کو بھی برصغیر پاک و ہند میں گویا داخلے ایک کی راہ مل گئی۔گو کے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوؤں کا فکر و فلسفہ برہمن مت اور بدھ مت کے آپس کے تصادم کے متعدد منازل طے کر چکا تھا، اور اب ویدوں اور اپنشدوں کی طرف نہ صرف مراجعت کر رہا تھا۔(۱۰) بلکہ فکر و عمل کے اعتبار سے یکسر تصوف بھی بن چکا تھا۔ بدھ مت نے ایک حیات گریز تصور کو فروغ دیا تھا۔اسی اثناء میں صوفیاء کرام بھی دنیا کے مختلف خطوں سے ہندوستان تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق عام لوگوں میں گھل مل گئے، انھوں نے عوام کی زبان میں شاعری کی اور محبت کے پیغام کو عام کرتے ہوئے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا، اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ! ان کی روحانی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات کے دائرے سے سے کسی طرح سے بھی کم نہ تھا۔جبکہ سید سلیمان ندوی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ! اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کو غزنی اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادہ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا۔(۱۱)

اگر دیکھا جائے تو صوفیاء کرام کا یہ وصف ہے کہ وہ عوام الناس کے باطن پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے دروازے مومن و مشرک سب کیلئے کھلے ہوتے ہیں۔چنانچہ ہندوستان میں آنے کے بعد ان صوفیاء کرام نے کبھی بھی اپنی علمی فضیلت کو راستے کی دیوار بننے نا دیا بلکہ انھوں نے عوام سے انھی کی کھڑی زبان میں بات چیت کا آغاز کیا اور وہ ہندوستان کے جس جس حصے میں بھی تبلیغ و اشاعت کے غرض سے گئے سب سے پہلے وہاں کی مقامی زبان کو اپناتے گئے پھر وعظ و نصیحت کے دوران انھوں نے کچھ عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال بھی بہ ضرورت وقت کیا۔چنانچہ اس قدیم دور کی اردو کے جو چند نمونے ہاتھ آئے ہیں ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان پندرہویں سے سترہویں صدی عیسوی تک پورے ملک میں رائج تھی اور اس کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کے کردار کو نظر انداز کرنا مشکل ہے گو کہ اس دور کی اس مخلوط مذکورہ بالا زبان کے ابتدائی نمونے زیادہ تعداد میں تو دستیاب نہیں ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گفتگو کی زبان ایک طویل عرصے کا سفر طے کر کے ہی کہیں تحریر کی زبان بنتی ہے، لہٰذا جو تحریری نمونے دستیاب ہیں انھیں دیکھ کر تو یہی اندازا لگایا جا سکا ہے کہ

اس زبان میں بول چال کا رواج بہت عرصہ قبل عام ہو چکا تھا۔ لہٰذا حضرت بابا فرید شکر گنج کے زمانے میں اس زبان نے ترقی کی جس منزل کو حاصل کر لیا تھا وہ ملاحظہ ہو۔

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کی برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید تیرا
خسپ کہ خیزی کہ ابھی رات ہے

لہٰذا صوفیاء کرام کی تحریک نے اردو کے ابتدائی دور میں نئے اسالیب بیان کو نا صرف فروغ دیا بلکہ مختلف مقامی بولیوں کے ملاپ سے اس کے ذخیرہ الفاظ میں بھی اضافہ کیا، صوفیاء کرام چونکہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے لہٰذا اردو زبان میں ہندوستان کے ہر خطے میں بولے جانے والے الفاظ غیر محسوس طور پر شامل ہوتے چلے گئے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ صوفیاء کرام نے اپنی تحریک کے ذریعے ہندوستانی مزاج کو عربی اور فارسی کے تہذیبی لہجے سے پہلے الفاظ کے استعمال سے اور پھر ترجمہ کے ذریعے سے آشنا کیا اسی تحریک کا ایک اور مثبت اثر یہ بھی ہوا کہ! انھوں نے مقامی بولیوں کو عربی رسم الخط میں ڈھالا اور عوام الناس کو اس رسم الخط سے مانوس بھی کیا اور اس طرح سے ایک مشترکہ رسم الخط وجود میں آیا جس کی وجہ سے اردو زبان ہندوستان کے گوشے گوشے میں لکھی، پڑھی، بولی، سوچی اور سمجھی جانے لگی، یہی نہیں بلکہ اس کے اثرات بیرون ہندوستان بھی جا پہنچے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوفیاء کرام کی تحریک نے اردو زبان کی نشوونما میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے اور اسی اساس پر اردو زبان نے آنے والی صدیوں میں اپنا ارتقائی سفر نہایت کامیابی سے طے کیا۔

گو کہ یہ درست ہے کہ اس زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات مرتب ہوئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے مختلف حکمران جن میں غزنوی، غوری، غلاماں، خلجی، تغلق، سادات لودھی اور مغلیہ خاندان شامل ہیں انھوں نے بھی اردو زبان پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔

ایک نظریے کے مطابق جس کے بانی انشاء اللہ خان انشاء ہیں، فرماتے ہیں کہ!

> وہ زبان جسے آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا باقاعدہ آغاز شاہ جہاں کے عہد میں ہوا تھا۔ (۱۲) جبکہ میر امن 'باغ و بہار' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ! اردو کی ابتداء اکبر اعظم کے دور میں ہوئی۔ (۱۳) گو کہ جدید تحقیق نے ان بیشتر پرانے نظریات کو فرسودہ قرار دے دیا ہے، لیکن ان نظریات کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔

سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ! اردو کی ابتداء سندھ سے۔۔ جبکہ محمود شیرانی کے مطابق! اردو کی ابتداء پنجاب سے ہوئی ہے۔ اسی طرح سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو کا سرچشمہ پنجابی نہیں بلکہ وہ قدیم زبان

ہے جس سے خود پنجابی نکلی ہے۔(۱۴) جبکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے حوالے سے کہتے ہیں کہ!اردو پالی کی ترقی یافتہ اور معیاری شکل ہے۔(۱۵) عین الحق کوٹی نے تو گویا اردو کا رشتہ دواڑی زبانوں سے جوڑ کر جڑوں کی تلاش کے کام کو مکمل کر دیا۔(۱۶)

اس حوالے سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ماننا ہے کہ!ان دعوؤں کی حقیقت کچھ بھی ہو،لیکن ایک بات اس سے ضرور ثابت ہو جاتی ہے،اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر علاقہ کسی نہ کسی دلیل پر اردو کی ابتداء اپنے سے منسوب کرتا ہے،اور اس طرح سے ہر علاقے سے اس کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔(۱۷)

ریختہ کی دوسری تحریک۔۔۔ولی دکنی

گو کہ برصغیر میں امیر خسرو کے عہد میں پہلا ریختہ متشکل ہو چکا تھا اور اس نے ارتقاء کی کئی منزلیں بھی بڑی کامیابی سے طے کی تھیں،یہی نہیں بلکہ اس میں ادب بھی تخلیق ہونا شروع ہو گیا تھا،پھر ولی دکنی کے عہد تک آتے آتے تو اردو زبان میں بہت پختگی آ چکی تھی۔حقیقت تو یہ ہے کہ مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی فارسی زبان کی قدر و قیمت میں بھی نمایاں کمی آنا شروع ہو گئی تھی،لیکن امیر خسرو نے ریختہ کی جس روایت کو فروغ دیا تھا اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جڑیں زمین کی گہرائی میں اترنا شروع ہو گئی تھیں۔بلا آخر ولی دکنی کا تجدد ایک ایسے ریختہ کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گیا،جس میں پورے ہندوستان کے ادبی عناصر کا کیمیائی مزاج موجود تھا جبکہ لسانی اعتبار سے شمال اور جنوب کے درمیان امتیاز کی سب حد بندیاں ختم ہو گئی تھیں۔لیکن اگر سیاسی سطح پر دیکھا جائے تو مسلمانوں نے متعدد مرتبہ ہندوستان کو متحدہ وحدت بنانے کی کوششیں کیں،لیکن زبان کے اختلاف نے ہمیشہ ہی اسے ناکام بنا دیا،بہر طور اس حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جا سکتی ہیں کہ لسانی اعتبار سے اولین وحدت ولی دکنی کے ریختہ کی بدولت وجود میں آئی اور اس نے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک مثبت اثرات کا مظاہرہ کیا،گو کہ یہ وہی زبان تھی جو ولی دکنی کے زمانے میں بولی جاتی تھی،لیکن ولی سے پہلے یہ زبان بازاری سمجھی جاتی تھی۔(۱۸) علمی اور ادبی حلقوں میں اس کا داخلہ ممنوع تھا،لیکن ولی کے امتزاجی عمل نے اس زبان کی غرابت کو دور کر کے اسے تونگر بنا دیا،اور اہل علم پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ فارسی شاعری کے مضامین کو ایک مقامی زبان بھی فکر و رعنائی سے گرفت میں لینے کی اہلیت رکھتی ہے تو وہ حیرت زدہ ہو گئے،اور نوجوان شعراء ولی کی زمینوں میں شعر کہنے لگے۔(۱۹) پس ولی کی تحریک نے دو مختلف المزاج زبانوں میں امتزاج پیدا کیا اور بقول محمد حسین آزاد کہ!ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہ آئی۔(۲۰)

اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی جنم لیا اور اس کا تحفظ بھی ہمیشہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ہوا ہر چند کے اس سلسلے میں کچھ ہندو مصنفین کے نام بھی سامنے آتے ہیں لیکن اس زبان کی

پرورش، نگہداشت، تحفظ اور بقاء کیلئے مسلمانوں نے ایک کامیاب کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان بننے سے اس زبان کے تحفظ کی ایک اور راہ نکل آئی ورنہ انڈین نیشنل کانگریس کے زیر اثر متعصب ہندوؤں نے اس زبان میں سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکال کر سنسکرت کے الفاظ شامل کر دیے تھے اور اسے ہندی کا نام دے دیا تھا اگر دیکھا جائے تو تحریک پاکستان میں ہندی اردو قضیہ ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ پاکستان کی تحریک میں اردو بھی لازم وملزوم حیثیت اختیار کر گئی تھی، گو کہ ہمارا قدیم مذہبی اور ثقافتی ورثہ عربی اور فارسی زبانوں میں موجود ہے لیکن اس کے اردو تراجم کو پڑھنا اور سمجھنا زیادہ آسان ہے اسی حوالے سے ایک بات اور بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ اردو زبان میں قرآن کریم کے تراجم، تفاسیر، ذخیرہ احادیث فقہ، علم الکلام، سیرت، اخلاقیات، عبادات اور تاریخ وتحقیق کو سمجھنا بھی آسان ہے۔

گو کہ عرصہ دراز سے اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لئے موثر اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں جن میں کئی تاریخ ساز شخصیات نے اپنا اہم کردار بھی ادا کیا ہے جیسے بابا اردو مولوی عبدالحق نے مسلم لیگ اور کسان تحاریک کے ذریعے اردو زبان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، انھوں نے ۱۹۳۰ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی اور اپنی آخری سانسوں تک وہ اس کی خدمت کے لئے کوشاں رہے۔ جبکہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں سردار عبدالرب نشتر نے لاہور میں مجلس زبان دفتر قائم کیا جس کی اہم ذمہ داریوں میں شامل تراجم اور اصطلاحات کو وضع کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اردو سائنس بورڈ، انجمن ترقی اردو اور دیگر کئی ادارے اور جامعات نے اردو زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے پھر اس کے ساتھ ہی اردو کی بے شمار کتب ورسائل نے بھی اپنے انداز سے اس زبان کی خدمت کی ہے۔

ابھی کچھ عرصہ قبل سرحد اسمبلی نے اردو کو دفتری زبان کے طور پر رائج کر کے ایک اہم اور موثر قدم کی جانب پیش رفت کی ہے جو یقیناً ایک مستحسن عمل ہے، اسی طرح سے ہمدرد پاکستان کہ جس کے بانی حکیم محمد سعید تھے، وہاں کی دفتری زبان بھی اردو ہے۔

آئین پاکستان کی رو سے بھی پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو ہی ہے لیکن افسوس صد افسوس کے حکومتی اداروں اور حکمران طبقے کی بے حسی کے باعث اب تک اردو کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو اس کا حق ہے۔ آج جب ہم اقوام عالم کی طرف نظر کرتے ہیں تو ایک بات بڑی وضاحت سے سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک نے تعلیم کے شعبے میں انتہائی سنجیدگی سے اقدامات کیے ہیں نیز انھوں نے اپنی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا ہے آج جب ہم چین، جاپان، روس، جرمنی، فرانس، انگلینڈ، امریکہ اور عرب ممالک کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ! ان کے یہاں تمام جدید علوم جن میں ریسرچ، طب، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، فلسفہ، ادب، کمپوٹر حتیٰ کہ خلائی تحقیقات تک شامل ہیں ان کی تحصیل ان کی اپنی زبان میں بڑی کامیابی سے کی جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنی مادری زبان میں سوچتے، سمجھتے، ہنستے

بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں۔ان کی اپنی زبان پر مضبوط گرفت نے ہی انھیں اقوام عالم میں ممتاز بنایا ہے۔چین، جاپان فرانس، روس، جرمن اور عرب ممالک کے سربراہان مملکت میں سے اکثریت انگریزی زبان سے ناواقف ہیں یہاں تک کے وہ غیر ملکی دوروں میں بھی اپنی ہی زبان میں خطاب کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کی بات کی وضاحت کیلئے مترجم ان کے ساتھ ہوتے ہیں، اور وہ اپنے ان خطابات کے دوران بڑے پر اعتماد نظر آتے ہیں اور انھیں شاید معمولی سی شرمندگی کا احساس بھی چھو کر نہیں گذرتا کہ وہ انگریزی زبان سے ناواقف ہیں۔انگریزی زبان سے ناواقفیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان پڑھ ہیں، بلکہ وہ اپنی اپنی زبانوں میں زیور علم سے آراستہ ہیں۔لیکن جب ہم اپنے اردگرد نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں دوہرے تعلیمی معیار اور اردو انگریزی میڈیم کی رسہ کشی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ہے اس طرز تعلیم کا نتیجہ اس مثل کے مصداق ہے کہ! 'کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول گیا' اول تو تعلیم انسان کو اپنی مادری زبان میں ہی حاصل کرنی چاہئے اور حکومت کو ایسے اداروں کی سرپرستی بھی کرنی چاہئے، لیکن ہمارے یہاں کے طبقاتی فرق بالخصوص وڈیرہ شاہی نظام میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اول تو عوام الناس کو تعلیم سے ہی دور رکھا جائے اور اگر بالفرض دیگر انھیں یہ سہولیات دے بھی دی جائیں تو اس کا معیار اتنا سطحی اور کمتر ہو کہ پڑھ لکھ کر بھی انسان جاہل کا جاہل ہی رہے اور اس کی ڈگریز بھی اس کے کچھ کام نہ آسکیں۔اس استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھانا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کیونکہ ہمارے یہاں اسی وجہ سے لوگوں کی اتنی بڑی تعداد بے روزگار ہے اور اگر دیکھا جائے تو ہمارے یہاں عجب افراتفری کا عالم ہے نوجوانوں کی بڑی تعداد پیشہ ورانہ تعلیم سے منسلک ہے، جس کا بنیادی مقصد اعلیٰ روزگار کا حصول ہے، اور یہی وجہ ہے کہ فکر معاش کے سبب ہمارے یہاں کا نوجوان طبقہ شعر و ادب اور فکر و فلسفے سے دور ہوتا جارہا ہے جس کے باعث معاشرے میں عدم استحکام اور بے حسی کا دور دورہ ہے ان مضامین سے دوری کے سبب افراد میں سے حس جمال رخصت ہوگئی ہے اور جس معاشرے میں سے حس جمال مفقود ہو جائے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس معاشرے سے انسانیت بھی کا درد بھی رخصت ہو گیا۔

اپنے قبلے کی سمت کو درست کرنے کیلئے ہمارے سامنے عباسی خلفاء کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، یوں تو خلیفہ المنصور اور ہارون الرشید کے دور خلافت میں علم کی ترویج و اشاعت کے لئے بڑے موثر اقدامات کیے گئے، لیکن خلیفہ مامون الرشید جو عباسی سلطنت کا ساتواں خلیفہ تھا جب وہ ۸۱۳ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہوا تو گویا اس نے تو کمال ہی کر دکھایا۔اس نے دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر کتب منگوائیں اور اس کا ترجمہ عربی زبان میں کروایا اس کام کیلئے اس نے ایک بہت بڑا ادارہ 'دارالترجمہ' کے نام سے قائم کیا۔اس دارالترجمہ میں دنیا بھر کی نادر کتب کا ان کی اپنی ہی زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔اس کام پر مامون الرشید نے بے تحاشا دولت سرف کی جس کے نتیجے میں ملک کے طول و عرض میں علم و حکمت کا بول بالا ہوا اور عوام الناس تک ان کی اپنی زبان میں علم پہنچا جس سے انھوں نے بے حد ترقی کی، مامون الرشید علم و فن کا

دلدادہ تھا اس کے دربار میں علماء، فضلاء، فقہاء، محدثین، متکلمین، محققین اور مترجمین کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی۔ اس کے دور خلافت میں افلاطون، ارسطو، بقراط، اقلیدس، جالینوس اور بطلیموس کی گرانقدر تصانیف کا ترجمہ ہوا نیز اس نے بے شمار قدیم اور قیمتی یونانی اور ایرانی کتب کے تراجم کروائے اس نے کرہ ارض کی پیمائش بھی کروائی نیز دنیا کی پہلی رصدگاہ اور دوربین بھی اس کے دور خلافت میں ایجاد ہوئی۔

اپنے اسلاف کے ان فخریہ کارناموں کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہیے، اور اردو زبان جو کہ ہمارا قومی ورثہ ہے اس کی حفاظت اور ترویج کے لئے اپنا کردار ادا کرتے رہنا چاہیے۔ نیز اس ضمن میں انفرادی اور اجتماعی کوششیں بالخصوص حکومتی اقدامات کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جدید تحقیقاتی کام اور تمام مروجہ علوم کا ترجمہ اردو زبان میں ہونا چاہیے تاکہ عوام کی بڑی تعداد اس سہولت سے استفادہ حاصل کر سکے اور حقیقتاً سیکھنے اور سمجھنے کا عمل جاری رہ سکے۔

اردو زبان پر انگریزی کے اثرات

اردو زبان پر انگریزی کے اثرات کے حوالے سے یہاں چند حقائق کا ذکر ضروری ہے۔

۱۸۱۳ء کے منشوری قانون میں پہلی مرتبہ کمپنی کی حکومت نے ایک لاکھ روپے سالانہ ہندوستانی رعایا کی تعلیم کیلئے مخصوص کیے اس وقت بعض انگریز ارباب اقتدار کی ایک جماعت کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان سیکھانی اور انھیں عیسائی مذہب کی طرف رغبت دلانی چاہیے کیونکہ بغیر اس کے ان کی حالت سدھارنے کی اور کوئی موثر تدبیر نہیں ہوسکتی۔(۲۱)

لارڈ ولیم بنٹنگ جو کہ مدراس کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ ۱۸۲۸ء میں انھیں دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا، جہاں وہ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے عہد میں کئی مشہور ملکی اصلاحات نافذ کی گئیں وہ چاہتے تھے کہ انگریزی زبان اور تعلیم کو ہندوستان میں عام کیا جائے، اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت زبان کی نادر کتب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

جبکہ انگریز اہل رائے کی یہ خواہش تھی کہ! یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں دی جائے لیکن سرکاری کونسل کا ایک رکن جنرل میکالے جو انگلستان کا مشہور مصنف بھی تھا اس کا یہ اصرار تھا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی زبان کو ہی قرار دیا جائے اس کی اس تجویز کی حمایت اس وقت کے بڑے بڑے پادریوں نے بھی کی، کیونکہ ان کے نزدیک مغربی علوم اور زبان کی تعلیم سے دین مسیحی کے پھیلنے میں آسانی پیدا ہوگی۔(۲۲) لہٰذا تھوڑی بحث و مباحثے کے بعد ہی انگریزی زبان کو سرکاری اسکولوں کی زبان مان لیا گیا، گو کہ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ہندوستان کے عوام مغربی زبانوں سے قطعاً نا آشنا تھے جبکہ جدید علوم کو سیکھنے اور سمجھنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ دیگر یورپی زبانوں کی تحصیل کریں اور اس کے ساتھ ہی

وہ ان پر دسترس بھی حاصل کریں۔ اگر دیکھا جائے تو انگریزی حکومت اور ان کی عمل داری سے قبل ہندوستان میں دو طرح کے تعلیمی نظام موجود تھے جس میں سے ایک ہندوؤں اور دوسرا مسلمانوں کا تعلیمی نظام تھا، لیکن اس کے علاوہ کچھ تعلیمی ادارے ایسے بھی تھے جہاں ہندو اور مسلمان دونوں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی اور فارسی زبان کے بڑے بڑے جید علماء ہندوستان میں موجود تھے تمام دفتری اور سرکاری کام فارسی زبان میں کیا جاتا تھا یہی نہیں بلکہ فارسی زبان اشرافیہ کی زبان سمجھی جاتی تھی اور اس کو ملک کے طول و عرض میں خاص اہمیت حاصل تھی جبکہ گھروں اور درسگاہوں میں اس کی تحصیل کا خاص انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن لارڈ میکالے کا یہ خیال تھا کہ! انگریزی زبان کے ذریعے ہی ہندوستانیوں کی ذہنی ترقی ممکین ہو سکے گی۔ (۲۳) گو کہ انگریزوں کی ان کوششوں اور انگریزی تعلیم کے فروغ سے ملازمت کے مواقع اور دنیاوی ترقی کے اسباب تو فراہم ہو گئے لیکن بہت کم ہی لوگ ایسے تھے جو اس زبان میں مکمل دسترس رکھتے تھے۔ عوام کی کثیر تعداد اس زبان سے قطعاً ناواقف تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد لارڈ میکالے کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا کہ! انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ عوام کی ذہنی اور اخلاقی ضرورتوں کی تکمیل کرے گا۔ (۲۴)

ابتداء میں تو ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، فقہ، حدیث، اور ہندو دھرم کی کتب پڑھائی جاتی تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں نمایاں کمی واقع ہونا شروع ہو گئی اور پھر بلا آخر وہ برائے نام ہی رہ گئیں۔ پھر اچانک انگریز حکومت نے یہ اشتہار دے دیا کہ! جو شخص سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ ہو گا یا فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر اس کی سند حاصل کر لے گا تو اسے دوسروں کے مقابلے میں ملازمت کیلئے اولین ترجیح دی جائے گی۔ (۲۵)

جنرل میکالے جو بحیثیت گورنر جنرل ہندوستان آیا تھا بعد میں اس کو تعلیمی کمیٹی کا سربراہ بھی بنا دیا گیا تھا، اس نے ۲ فروری ۱۸۳۵ء میں ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کے حوالے سے ایک یادداشت مرتب کی، جنرل میکالے چونکہ انگریزی تعلیم کا حامی تھا اور مغربی علوم کی اہمیت اور افادیت کو بڑھا چڑھا کر بیان بھی کیا کرتا تھا اسی نے اس یادداشت میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا کہ! مشرقی زبانیں جدید تمدن کے خیالات سے عاری ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ سائنسی نظریات کی وضاحت پوری طرح سے کر سکیں برخلاف اس کے کہ انگریزی زبان کو نا صرف یہ کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں ادبی اعتبار سے بلند مرتبہ حاصل ہے بلکہ وہ تمام حقیقی علوم و فنون کے خزانوں کی کنجی بھی ہے۔ (۲۶)

جنرل میکالے ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان کے فروغ کیلئے اقدامات کرنا چاہتے تھے ان کے خیال میں ایسے تمام تعلیمی اداروں کی سرکاری اور غیر سرکاری امداد بند ہو جانا چاہیے کہ جہاں مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی ہو۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ! ہندوستان کی مقامی زبانوں میں علم و ادب نام کو بھی نہیں ہے جبکہ عربی اور فارسی کے متعلق ان کا یہ ماننا تھا

کہ! یورپین کتب خانے کی ایک چھوٹی سی الماری کی کتابوں میں ہمیں جتنا علم ملتا ہے اس کی قدر و قیمت ہندوستان اور عرب کے مجموعی علم وادب سے زیادہ نہیں ہے۔(۲۷) چنانچہ حکومت ہند نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں یہ فیصلہ کیا کہ! ہندوستان کے تمام سرکاری دفاتر کی زبان آج سے فارسی کے بجائے انگریزی ہوگی اور ان دفاتر میں مکمل لکھنے اور پڑھنے کا کام بھی انگریزی زبان میں ہی کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی آئندہ صرف انھی سرکاری مدارس کو حکومتی امداد دی جائے گی کہ جہاں انگریزی زبان کے ذریعے مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہوگا۔(۲۸) یہی وجہ ہے کہ اس وقت سے آج تک کم وبیش ہندوستان کے تقریباً تمام ہی تعلیمی اداروں میں وہی تعلیمی نظام موجود ہے کہ جس کی داغ بیل لارڈ میکالے کی یادداشت سے پڑی تھی۔(۲۹) انگریزوں نے برصغیر میں جو انگریزی نظام تعلیم متعارف کروایا تھا اس کے پیچھے ان کے اپنے سیاسی مقاصد بھی بڑے صاف اور واضح تھے وہ یقینی طور پر برصغیر میں ایک ایسے طبقے کو پیدا کرنا چاہتے تھے جو غلامانہ سوچ کا مالک ہو۔ بقول لارڈ میکالے! ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ ہونا چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق ،طرز فکر، اخلاق اور فہم وفراست کے نقطہ نظر سے انگریز ہو۔

بلا آخر انگریزوں کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور وہ برصغیر میں انگریزی نظام تعلیم کے ذریعے سے ایک ایسے طبقے کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے جو بہترین غلام تھے۔ آج انگریزوں کو برصغیر سے گئے کئی سال گزر چکے، لیکن آج بھی ہم انگریزوں کے بہترین غلام ہیں اور اسی غلامانہ سوچ کے شکنجے میں آج تک محصور بھی۔

آج اگر دنیا بھر میں رائج تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ! ہر نظام تعلیم کے پیش نظر بڑے بڑے مقاصد ہوتے ہیں اور ان مقاصد کی حیثیت ان کے نظام میں محور اور مرکز کی سی ہوتی ہے، جس کے حصول کیلئے حکومتیں اور عوام مسلسل جدوجہد کرتی ہیں۔ مثلاً فرانس کے تعلیمی نظام کے درپیش مقاصد میں حریت، اخوت اور مساوات کا حصول شامل ہے، جس سے فرانس میں ایک عظیم الشان انقلاب نے شہنشاہیت سے لے کر کلیساء تک کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اسی طرح سے جاپان کا تعلیمی نظام، جرمن کے تعلیمی نظام سے اخذ شدہ ہے، اور جس کے مقاصد میں عظمت وطن کو اولیت حاصل ہے لہٰذا ہر جاپانی کی یہ بچپن سے ہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک وقوم کی عزت وعظمت میں اضافہ کرے اور زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا کام ضرور کرے جس سے اس کے ملک کی سربلندی میں اضافہ ہو۔

لیکن برصغیر پاک وہند میں انگریزوں کے دیے ہوئے نظام تعلیم میں قومی مقاصد کے عناصر تو سرے سے ہی مفقود ہیں ،ہاں لیکن انفرادی سطح پر بہترین کلرکوں کی ایک نہ ختم ہونے والی کھیپ ضرور تیار کر لی گئی ہے۔ لیکن بہرحال یہ مقام افسوس ہے کہ! آج پاکستان کو بنے ہوئے تقریباً ۶۶ سال ہونے کو آئے لیکن اس کے باوجود آج تک ہمارے حکمران نظام تعلیم کے مقاصد کا درست تعین کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نہ تو انھوں نے کبھی اس نظام کو

بدلنے کے بارے میں سوچا اور نہ ہی کبھی اس کے لئے کسی سنجیدہ اقدام کی کوشش ہی کی گئیں۔ لہٰذا انگریزوں کا دیا ہوا وہی پرانا اور فرسودہ نظام تعلیم اور اس کے مقاصد جوں کے توں موجود ہیں اور سرے دست نہ ہی ان کے بدلنے کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے پاکستان کی گذشتہ تمام حکومتوں نے ہی تعلیم کو ایک غیر اہم شعبہ جانتے ہوئے اسے اپنی آخری ترجیحات میں رکھا۔ بجائے اس کے کہ وہ قومی زبان کی قدر و منزلت کرتے اور اس زبان کی ترویج واشاعت میں اپنا کردار ادا کرتے، صورت حال اس کے بالکل ہی برعکس نکلی۔ دوسری جانب عوام الناس نے بھی انگریزی زبان کو اپنی ترقی کی کنجی سمجھتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا ہے جبکہ حکمرانوں اور طبقہ اشرافیہ کے لئے انگریزی زبان ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ شاید دونوں ہی یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انگریزی کے بغیر ترقی کا تصور محال ہے، لیکن بہر صورت انھیں اقوام عالم پر ایک نظر ضرور ڈالنی چاہئے، کہ جنھوں نے زندگی کہ ہر شعبے میں نا صرف نمایاں ترقی کی بلکہ اس ترقی کے پس پردہ ان کی اپنی زبان کا مضبوط اور اہم کردار بھی نا قابل فراموش حیثیت رکھتا ہے۔

خلاصہ بحث

مختصر یہ کہ! زبانیں معاشرتی ضروریات کے تحت وجود میں آتی ہیں اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں پر اپنے اثرات بھی مرتب کرتی ہیں، اردو ہماری قومی زبان ہے جو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہونے کے ساتھ ہی اپنی ایک قدیم تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے، اس زبان نے ہندوستان میں سنسکرت زبان پر بڑی کاری ضرب لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام کی مقبول زبان بن گئی، اردو ایک زندہ زبان ہے لیکن بدقسمتی سے اسے اس ملک میں وہ مقام اور مرتبہ حاصل نا ہو سکا جس کی یہ مستحق تھی۔ گو کہ اس زبان کو بحیثیت زبان نقصان پہنچانے کی بھی کئی بار بڑی منظم کوششیں کی گئیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو انگریزوں نے کبھی اس زبان کی خدمت بھی کی تھی، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ انھی کے دور اقتدار میں اس کو باقاعدہ نقصان پہنچانے کے بھی اقدامات کئے گئے جو کہ اب تک کسی نہ کسی صورت میں جاری وساری ہیں، گو کہ اس میں حکمران اور طبقہ اشرافیہ کہ اپنے مفادات بھی شامل ہیں۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام جن میں امریکہ، انگلینڈ، چین، جاپان، روس، جرمن، فرانس اور بے شمار عرب ممالک شامل ہیں وہ اپنی زبان میں سوچتے، سمجھتے، بولتے، لکھتے، پڑھتے اور تحقیق وتدریس کی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں۔

لیکن ہمارے یہاں کے معاملات اس کے بالکل برعکس ہیں پھر رہی سہی کسر دوہرے تعلیمی نظام نے پوری کر دی، اور اسی دوہرے تعلیمی نظام کی وجہ سے عوام بھی دوہرے عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کسی کو انگریزی نہیں آتی ہے تو کوئی اردو سے ناواقف ہے، کسی کو دو جملے اردو کے لکھنے نہیں آتے تو کوئی انگریزی میں درخواست لکھنے سے قاصر ہے، الغرض عوام سے لے کر خواص تک ہر کوئی کسی نہ کسی اعتبار سے اس نظام کی لپیٹ میں ہے۔ لہٰذا حکومتی اور عوامی سطح پر اس مسئلے کے یقینی حل

کیلئے کوششیں کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

حوالہ کتب

۱۔ایس۔ایم معین قریشی، اردو زبان وادب، شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸

۲۔سید قاسم محمود، شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا (جلد اول)، ناشر انا الفیصل لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۸۶

۳۔ایضاً، ص ۱۸۶

۴۔امیر خسرو، مقالہ 'خسرو کی خودنوشت' ترجمہ۔ریاض صدیقی، رسالہ افکار کراچی، خسرو ایڈیشن، ص ۴۵

۵۔حکیم سید شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، جنرل پبلیشنگ ہاوس کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۵۲

۶۔عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۵۳۸

۷۔رام بابو سکسینہ، مترجم۔محمد عسکری مرزا، تاریخ ادب اردو، بار سوم س۔ن، نولکشور پریس لکھنو، سن ندارد، ص ۱۶

۸۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند (جلد ششم)، مکتبہ خیابان لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۸

۹۔ڈاکٹر وزیر آغا، مقالہ 'خسرو'۔۔۔نئے تناظر، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۵

۱۰۔خلفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ص ۳۶۹

۱۱۔سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۳۹ء، ص ۲۶

۱۲۔ایس۔ایم۔معین قریشی، اردو زبان وادب، ص ۱۹

۱۳۔ایضاً، ص ۲۱ ۱۴۔ایضاً، ص ۲۰۔۲۱

۱۵۔ڈاکٹر شوکت سبزواری، اردو زبان کا ارتقاء، گہوارہ ادب ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء، ص ۸۷

۱۶۔عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، اورینٹ ریسرچ سینٹر ملتان روڈ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۰

۱۷۔ایس۔ایم۔معین قریشی، اردو زبان وادب، ص ۲۱

۱۸۔محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، مکتبہ خیابان لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۱

۱۹۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ایہام گو اور دیگر شعراء، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، (جلد ہشتم)، جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۶۴

۲۰۔محمد حسین آزاد، آب حیات، شیخ مبارک علی لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۸۹

۲۱۔ڈاکٹر یوسف حسین خان، تاریخ ہند، دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۸ء، ص ۲۰

۲۲۔مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی، تاریخ ہند (حصہ۔اول، دوم اور سوم)، دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۷۳ء، ص ۳۸۷

۲۳۔ڈاکٹر یوسف حسین خان، تاریخ ہند، ص ۶۳۱ ۲۴۔ایضاً، ص ۶۳۱

۲۵۔غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۴۵

۲۶۔ڈاکٹر یوسف حسین خان، تاریخ ہند، ص ۳۳۹ ۲۷۔ایضاً، ص ۳۳۹

۲۸۔ایضاً، ص ۳۴۰ ۲۹۔ایضاً، ص ۳۴۰